45

اپنے کام کے مقابلہ میں خدا کے انعام پر نظر کرو

(فرمودہ ۲۴ مارچ ۱۹۲۲ء)

تشہد و تعوذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے فرمایا۔

انسانی زندگی کا دور نہایت ہی محدود ہے۔ اور اتنا محدود ہے کہ کائنات زمانہ کی وسعت پر نظر ڈالتے ہوئے انسانی زندگی کو سمندر کے حباب کی طرح بھی قرار نہیں دے سکتے۔ ایک وسیع سمندر میں جو حباب پیدا ہوتا ہے۔ اور سمندر کے ساتھ اس کی جو نسبت ہوتی ہے۔ اتنی نسبت بھی انسانی زندگی کو کائنات کی وسعت کے ساتھ نہیں ہے۔ پھر ایسے محدود دور کے لئے جو انعامات اللہ تعالیٰ نے مقرر کئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیسی رحیم و کریم وہ ذات ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہم پر انعامات کرتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں لوگوں کی عمریں پچاس ساٹھ ستر اور زیادہ سے زیادہ سو یا سوا سو سال ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ڈیڑھ سو سال بھی عمر مان لی جائے۔ جو شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ اور ایک صدی میں ایک یا دو انسان اس عمر کو پہنچتے ہیں تو بھی اس میں سے پچاس سال سونے میں گذر جاتے ہیں۔ پھر اگر اس میں سے نابالغی کا زمانہ نکال دو تو اور بھی کم رہ جاتی ہے۔ پھر کھانے پینے پیشاب پاخانہ کرنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے۔ وہ نکال دیا جائے تو اور کمی ہو جاتی ہے۔ پھر انسان لغو باتوں میں جو وقت ضائع کرتے ہیں وہ نکال دیا جائے تو اور بھی کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر اوسط عمر ۷۰۔۸۰ سال فرض کرلی جائے تب بھی اس عمر کے انسان کے کام کا زمانہ دس' پندرہ یا ۲۰ سال سے زیادہ نہیں بنتا۔ یہ ایسا زمانہ ہے جس میں انسان کچھ کام کرتا ہے اس کام کے بدلے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اس کو نہایت مختصر الفاظ میں قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "جنات عدن" باغ ہونگے جس کے رہنے والے بھی ہمیشہ رہیں گے۔ اور باغ بھی ہمیشہ اور ان کے پھل بھی ہمیشہ رہیں گے۔ پھر فرمایا۔ **عطاء غیر مجذوذ** (ھود ۱۰۹) ایسا انعام ہو گا جو کبھی نہیں کاٹا جائے گا۔ کوئی وقت ایسا نہیں آئے گا۔ جب یہ کہہ دیا جائے کہ اب انعام کافی مل گیا۔

بلکہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔ گویا اس جہان میں انسان خدا کا ظل ہو جائے گا۔ کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ پر فنا نہیں اسی طرح ایک رنگ میں اس انسان پر فنا نہیں ہوگی۔ گو اصلی ذات خدا تعالیٰ ہی کی ہے جسے بقا حاصل ہے۔ مگر انسان کو بھی ایک شکل بقا کی حاصل ہو جائے گی اور انسان خدا میں ہو کر رہے گا۔

مگر خیال تو کرو کہ ایسا انعام کس کام کے نتیجہ میں ملتا ہے۔ اسی کام کے نتیجہ میں جو دس پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں کیا جائے گا۔ پھر کیا یہ سارے سال خدا کے لئے خرچ کئے جاتے ہیں۔ شاذونادر لوگوں کے سوا باقی سب لوگوں کے بہت سے اوقات لغو باتوں میں خرچ ہوتے ہیں۔ عبادتوں یا خدا کے دین کی خدمت کا وقت دو یا تین گھنٹے دن میں بنتا ہے۔ اس طرح کام کرنے کا جزو اور بھی قلیل رہ جاتا ہے اور جتنا عرصہ کام کرنا تھا وہ بھی سارے کا سارا انسان دین میں نہیں لگاتا۔ مگر دیکھو اس آٹھ دس سال کے کام کے بدلے میں ایسی عظیم الشان برکات حاصل ہونگی کہ جن کا کبھی خاتمہ ہی نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان کے وہم میں بھی اس جنت کا نقشہ نہیں آسکتا۔ زمانہ کی وسعت کے لحاظ سے تو اس کے متعلق یہ ہے کہ جنت غیر محدود نہ کٹنے اور نہ ختم ہونے والا انعام ہے۔ اور انعام کی وسعت کے لحاظ سے یہ ہے کہ اس میں اتنی وسعت اور اتنی انواع ہیں کہ انسان کو ان کا پتہ ہی نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ انسان کی نظر دنیا کی نعمتوں تک ہی پہنچتی ہے۔ اور دنیا کی نعمتوں کو جنت کی نعمتوں سے کچھ نسبت نہیں۔

اتنے بڑے اور ایسے عظیم الشان انعام اتنے قلیل زمانہ کی خدمات کے بدلے ملتے ہیں۔ ذرا غور کرو کیا قربانی ہے جو ان انعامات کے لئے انسان کرتا ہے۔ دنیا کے کاموں پر ہی نظر کرو۔ ایک انسان پندرہ سولہ سال پڑھتا دن رات محنت کرتا ہے۔ اور اتنے سال کی محنت کے بعد اس کی عمر پچیس تیس سال تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کی ساری عمر اگر ساٹھ سال قرار دی جائے تو گویا وہ تیس سال کی عمر میں فائدہ اٹھانے کے لئے پچیس تیس سال محنت کرتا ہے۔ اور پھر اتنا عرصہ پڑھنے کے بعد بھی مال و دولت خود بخود اس کے گھر میں نہیں آجائے گا۔ اور وہ محنت جو اس نے پڑھنے میں کی۔ وہ کافی نہ ہوگی۔ بلکہ پھر بھی اسے محنت کرنی پڑے گی۔ پس ایک انسان اپنی عمر کے پندرہ سولہ سال آئندہ عمر تیس چالیس سال کے لئے خرچ کرتا ہے۔ پھر وہ انعام جس کی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور جس کے زمانہ کی کوئی حد بندی نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے جس قدر بھی قربانی کی جائے کم ہے۔ لیکن عام طور پر چونکہ لوگوں کو اس انعام پر یقین نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے واسطے وقت صرف نہیں کرتے اور اگر کرتے بھی ہیں۔ تو اس شوق سے نہیں جس شوق سے دنیاوی امور کے لئے عمر ضائع کرتے ہیں۔ ضائع میں اس لئے کہتا ہوں کہ عمر ختم ہو جانے والی چیز ہے۔ اور جن

دنیاوی باتوں کے لئے خرچ کی جاتی ہے وہ بھی عارضی اور چند روزہ ہیں تو جس انعام کے لئے بہترین حصہ عمر خرچ کرتے ہیں وہ چونکہ نظر آتا ہے۔ اس لئے اس میں تو بڑے شوق سے لگے رہتے ہیں۔ لیکن دوسرے جہان میں ملنے والا انعام نہ انہیں نظر آتا ہے۔ اور نہ اس پر انہیں یقین ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ کسی طالب علم کو اگر یہ کہا جائے۔ کہ دیکھو تمہاری پچاس سال عمر ہوگی۔ اس سے کچھ تمہارے بچپن کا زمانہ گذر گیا۔ اور پندرہ سولہ سال تک تم پڑھتے رہو گے۔ اس طرح پچیس تیس سال عمر تک تم پڑھائی میں مشغول رہو گے۔ اس کے بعد کہیں جا کر فائدہ اٹھاؤ گے۔ اس لئے بہتر ہے کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ تو وہ کبھی یہ مشورہ قبول نہیں کرے گا۔ اور یہ کہنے والے کو نادان سمجھے گا۔ لیکن تعجب آتا ہے کہ اس انعام کے لئے جس کا کبھی خاتمہ نہیں اور جس کی وسعت کا اندازہ نہیں۔ اس کے لئے لوگ تیاری نہیں کرتے۔ یہ جتنی خرابی پیدا ہوتی ہے عدم یقین کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان حقیقی طور پر سمجھتا ہی نہیں کہ مرنے کے بعد بھی وہ اٹھایا جائے گا۔ اور جو لوگ یہ مانتے ہیں وہ بھی رسمی عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ یقینی طور پر نہیں مانتے۔ اور یقین اور عقیدہ میں بڑا فرق ہے۔ عقیدہ کے متعلق تو عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اس کے متعلق غور کرنا بھی ناجائز سمجھتے ہیں ورنہ جب لوگ معمولی معمولی باتوں کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو کیوں خدا تعالیٰ کے لئے قربانی کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیاوی باتوں کا انہیں حقیقی یقین ہوتا ہے۔ مگر خدا تعالیٰ کی باتوں کو صرف عقیدتاً مانتے ہیں۔ ان پر یقین نہیں رکھتے۔ ماں باپ سے انہوں نے سنا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ہے۔ اس لئے وہ بھی کہتے ہیں۔ خدا ہے۔ ماں باپ سے سنا ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد اٹھنا ہے۔ اس لئے وہ بھی کہتے ہیں۔ اٹھنا ہے۔ ماں باپ سے سنا ہوتا ہے۔ بدیوں کے نتیجہ میں سزا ملے گی۔ اس لئے ہ بھی مانتے ہیں۔ اور گو زبان سے ان باتوں کا اقرار کرتے ہیں۔ مگر ان کی عقل اندر سے انکار کر رہی ہوتی ہے اور چونکہ وہ عقیدہ کے طور پر مانتے ہیں۔ اس لئے عقیدت کی وجہ سے غور نہیں کرتے اور ڈرتے ہیں کہ اگر کیا تو ممکن ہے غلط نکل آئے۔ ایسا کچا اور بودہ عقیدہ ان کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے آدمی جب کئی غیر احمدیوں کے پاس جاتے اور انہیں تبلیغ کرنے لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ہم تمہاری باتیں نہیں سننا چاہتے تاکہ ہمارا ایمان خراب نہ ہو جائے۔ حالانکہ اگر ان میں فی الواقع ایمان ہوتا تو اس کے خراب ہونے کے کیا معنی۔ کبھی ایمان بھی خراب ہوا کرتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے۔ کہ وہ جن باتوں کو مانتے ہیں صرف زبان سے مانتے ہیں۔ ان کے دلائل ان کے پاس نہیں ہوتے۔ اور انہیں ڈر ہوتا ہے کہ اگر ان کے خلاف دلائل سنے تو چھوڑنی پڑیں گی۔ اس لئے وہ سنتے ہی نہیں۔ اور کہتے ہیں کہ سننے سے ہمارا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ایمان تو وہ چیز ہے۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم

فرماتے ہیں۔ کہ جب کسی میں ایمان پیدا ہو جائے تو ایمان کی ادنیٰ بشاشت یہ ہے کہ وہ آگ میں پڑنا تو پسند کر لے گا لیکن ایمان نہیں چھوڑے گا۔ا۔ یہ ادنیٰ درجہ ہے ایمان کا۔ ان لوگوں میں ایمان ہی کہاں ہوتا ہے جو کہتے ہیں خراب ہو جاتا ہے۔ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ میں کسی کی بات اس لئے نہیں سنتا کہ میرا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ وہ گویا خود اقرار کرتا ہے کہ اس میں ایمان نہیں ہے۔ ماں باپ سے سن کر اور ساتھیوں کے میل وملاپ کی وجہ سے جو کچھ مانتا ہے۔ مانتا ہے۔ ورنہ اسے یقین حاصل نہیں ہوتا۔ عام طور پر لوگوں کا یہی حال ہے کہ سنی سنائی باتوں کو مانتے ہیں۔ اسی لئے ان کے لئے قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اردو میں مثل ہے سو گز واروں ایک گز نہ پھاڑوں۔ یہی مثال ان کی ہوتی ہے۔ منہ سے جتنا چاہو ان سے اقرار کرالو۔ وہ کہنے کو تو کہدیں گے کہ ہم خدا اور رسول اور اسلام پر قربان ہونے کو تیار ہیں۔ مگر جب وقت آئے گا تو قربان ہونا تو الگ رہا۔ معمولی سی قربانی کرنے کے لئے بھی آمادہ نہ ہونگے۔ یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ان میں ایمان نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایمان کی علامت تو یہ ہے کہ خواہ کس قدر بھی مشکلات میں انسان کو ڈال دیا جائے وہ پروا نہیں کرتا۔ اور جب تک مشکلات کی بھٹی میں نہ ڈالا جائے۔ اس وقت تک ایمان کا پتہ نہیں لگتا۔ اس لئے ہمیشہ نبیوں کے ماننے والوں کو ابتلا آتے رہے ہیں۔ یہ دو قسم کے ابتلاء ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو بندہ خود اپنے اوپر اپنی مرضی سے نازل کرتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو خداتعالیٰ نازل کرتا ہے۔ بندہ کی اپنی مرضی پر جو ابتلا چھوڑے جاتے ہیں۔ وہ مثلاً نماز روزہ ہیں۔ ان میں سہولت کے سامان انسان کر سکتا ہے۔ مگر ایک وہ ابتلا ہوتے ہیں جو خدا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ بندہ اگر چاہے کہ ان میں سہولت کرلے تو نہیں کر سکتا۔ یہ اس لئے آتے ہیں کہ خدا بندہ پر اس کے ایمان کی حالت ظاہر کردے۔ اس لئے نہیں آتے کہ خدا کو انسان کا پتہ نہیں ہوتا۔ اور یہ مت خیال کرو کہ کیا بندہ اپنا حال بھی نہیں جانتا۔

سب سے بڑی مصیبت یہی ہے کہ لوگ اپنے دل کا حال نہیں جانتے۔ اگر یہ بات نہ رہے تو ساری خرابی دور ہو جائے۔ اپنے دلوں کے متعلق لوگوں کے غلط خیال ہوتے ہیں۔ اس کی موٹی مثال یہ ہے کہ عام طور پر بہادر اور دلیر انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ اور زیادہ ایسے ہوتے ہیں جو خطرات سے ڈرتے ہیں۔ لیکن اگر سو آدمی کو بٹھا کر لڑائی کی خبریں سناؤ تو ان میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ اگر اس موقع پر ہم ہوتے تو یوں کرتے۔ لڑنے والوں نے یہ کمزوری دکھائی۔ اور یہ خرابی کی اور یہ یونہی نہیں کہتے۔ بلکہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم ہوتے تو اس طرح کرتے۔ یہ جھوٹ نہیں بول رہے ہوتے۔ مگر جب موقع پر لا کر کھڑا کر دیا جائے تب انہیں پتہ لگتا ہے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح انسان کو ہزاروں چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ اور ہزاروں سے نفرت۔ مگر درحقیقت

اسے نہ ان سے محبت ہوتی ہے جن سے وہ محبت سمجھتا ہے اور نہ ان سے نفرت ہوتی ہے جن سے وہ نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ ایک وقت جس چیز سے اسے محبت ہوتی ہے۔ دوسرے وقت اسی سے نفرت کرتا ہے۔ اور جس سے نفرت ہوتی ہے اسی سے محبت جتانے لگتا ہے۔ آج ایک شخص سے اس کی صلح ہوتی ہے۔ اور اسے اپنا دوست سمجھتا اور خیال کرتا ہے کہ میں کبھی اسے چھوڑ نہیں سکتا لیکن شام کو اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اسی طرح صبح کو ایک شخص سے اس کی دشمنی ہوتی ہے اور اس کی شکل سے بھی بیزار ہوتا ہے۔ لیکن شام کو اس کا ایسا دوست بن جاتا ہے کہ کہتا ہے اگر کوئی اسے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے گا تو میں اسے جان سے ماردوں گا۔ایسے تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہے کہ عام طور پر انسان اپنے دل کی حالت نہیں جانتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس کے قلب کی حالت بتانے کے لئے یہ کیا ہے کہ اسے ابتلاؤں میں ڈالتا ہے۔ تاکہ خطرناک حالتوں سے گذر کر اسے اپنی حقیقت کا علم ہو جائے۔

ہمارے زمانہ میں اس لئے کہ ہماری حالتیں بوجہ مدتوں مغلوب رہنے کے اچھی طرح مضبوط نہیں۔ اور ہم میں وہ دلیری اور جرأت نہیں جس کی ضرورت بڑے بڑے ابتلاؤں کو برداشت کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے خداتعالیٰ نے ہم پر رحم کرکے ہمیں ایسے ابتلاؤں میں نہیں ڈالا جیسے پہلے انبیاء کی جماعتوں کے لئے آتے رہے ہیں۔ خداتعالیٰ برداشت کرلینے کی ہمت دیکھ کر ابتلا ڈالتا ہے۔ یہ نہیں کہ جو ابتلاء برداشت کرنے کی طاقت نہ ہو وہ ڈال دے۔ ہاں انسان ایسے ابتلاؤں میں ضرور ڈالا جاتا ہے۔ جن کے متعلق وہ خیال کرتا ہے کہ برداشت نہیں کر سکوں گا لیکن یہ خیال غلط ہوتا ہے اور اس طرح خدا پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اللہ نے اس پر ظلم کیا ہے کہ جس بوجھ کے اٹھانے کی اس میں طاقت نہ تھی۔ اسے اس پر ڈال دیا۔ حالانکہ خداتعالیٰ کی طرف سے کبھی ایسا نہیں ہوتا۔ خداتعالیٰ فرماتا ہے **لا یکلف اللہ نفسا" الا وسعھا** (البقرۃ: ۲۸۷) خدا کسی پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جس کے اٹھانے کی اسے طاقت نہ ہو۔ بوجھ وہی ڈالا جاتا ہے جس کے اٹھانے کی طاقت ہوتی ہے۔ مگر اس وقت تک جب تک کہ اس قوم کو تباہ کرنے کا منشاء نہیں ہوتا۔ جو ابتلاء کسی جماعت کی ترقی کے لئے آتے ہیں وہ طاقت برداشت سے باہر نہیں ہوتے۔ ہاں جو ہلاکت کے لئے ہوتے ہیں وہ ضرور باہر ہوتے ہیں۔ پس مومن کے ابتلاء طاقت سے باہر نہیں ہوتے۔ ہاں وہ خیال کرلیتا ہے کہ باہر ہیں۔ مگر یہ اس کی غلطی ہوتی ہے۔ جب مومن ایک ابتلا کو برداشت کرلیتا ہے تو اسے پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کا ایمان کتنا مضبوط ہے۔ پھر اور رنگ میں اس پر ابتلا آتا ہے۔ یا اسی رنگ میں آتا ہے جس رنگ میں پہلے آیا ہوتا ہے۔ مگر زیادہ سخت اگر اس کو برداشت کرلیتا ہے اور اس سے دل میں کسی قسم کا شکوہ و شکایت پیدا ہونے کی بجائے شکر و امتنان پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے

اپنے فضل سے مجھے اتنی طاقت دی کہ میں نے اسے برداشت کرلیا۔ تو اس کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس سے بڑا ابتلا برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ جیسے جوں جوں انسان کو دلیری ہوتی جاتی ہے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کی حالت ہوتی ہے۔ وہ جوں جوں دلیر ہوتا جاتا ہے۔ آگے بڑھتا جاتا ہے اس طرح ایک تو اسے اپنے ایمان کی پختگی کا پتہ لگتا جاتا ہے دوسرے اسے آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ تو ابتلاء کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان کو اپنی حالت کا پتہ لگتا ہے کہ خدا کی راہ میں کس قدر تکلیف اٹھا سکتا ہے۔ اور تکلیف کے وقت کس قدر مضبوط رہ سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آگے قدم بڑھانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے۔

ابتلاؤں کا آنا ایسی ضروری بات ہے کہ نبیوں کی کوئی جماعت ایسی نہیں ہوئی کہ جس پر ابتلا نہ آئے ہوں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ **ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلھم** (البقرۃ: ۲۱۵) کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ نعمت اور وہ انعام جس کی وسعت کا اندازہ نہیں لگا سکتے انہیں یونہی مل جائے گا۔ اور ان پر وہ حالت نہ گزرے گی جو پہلوں پر گذرتی رہی۔ وہ حالت ضرور گزرے گی۔ اس لئے یہ مت خیال کرو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ جب تک ان حالتوں میں سے نہ گزرو گے جن میں سے پہلے گزرے۔ انہیں کیا ہوا تھا۔ اور ان کی حالت کیسی ہوئی۔ ان کی حالت ایسی ہو گئی کہ **مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین امنوا معہ متیٰ نصر اللہ** ان کو بڑی بڑی تکالیف پہنچیں۔ جسمانی بھی اور مالی بھی۔ انہیں اپنی جائیدادیں چھوڑنی پڑیں۔ رشتہ داروں کو ترک کرنا پڑا۔ فاقے کرنے پڑے۔ ماریں انہوں نے کھائیں۔ قتل وہ ہوئے غرضیکہ کئی کئی رنگ میں ہلائے گئے۔ جس طرح زلزلہ آتا ہے تو عمارت کبھی دائیں گرنے لگتی ہے۔ کبھی بائیں۔ اسی طرح دیکھنے والے ان کے متعلق کہتے تھے کہ یہ اب گرے۔ حتیٰ کہ ان کی تکالیف بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچ گئیں کہ دشمن نے خیال کیا کہ اب یہ گر ہی گئے۔ اس وقت اللہ کے رسول اور مومنوں نے دعا کرنی شروع کی کہ **متیٰ نصر اللہ** اے خدا ابتلا اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ مدد آجائے **متیٰ نصر اللہ** کے لفظی معنی یہی ہیں کہ کب مدد آئے گی اور لوگ کہتے ہیں کہ ان کو خدا کی مدد کے متعلق شک پیدا ہو گیا تھا کہ شاید آئے۔ نہ آئے اس لئے انہوں نے کہا کب مدد آئے گی۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ سوال التجا کا رنگ بھی رکھتا ہے۔ انسان کسی سے پوچھتا ہے کہ یہ بات آپ کب کریں گے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ نہیں کریں گے بلکہ یہ کہ کر دیں۔ اسی طرح مجسٹریٹ سے جب پوچھا جاتا ہے کہ میری باری کب آئے گی تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ

کبھی نہیں آئے گی۔ بلکہ یہ کہ آجائے۔ تو **متیٰ نصر اللہ** انہوں نے دعائیں کرنی شروع کر دیں کہ الٰہی ابتلاء بڑھ گئے ہیں اب مدد آجائے۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے **الا ان نصر اللہ قریب** خدا کی مدد قریب ہی ہوتی ہے۔

ہر ابتلاء کے ساتھ مدد آتی ہے۔ جب ابتلاء تمہاری ترقیات کے لئے آئیں۔ تو پھر تمہیں تباہ ہونے کا ڈر نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر تمہارے نفسوں میں خرابی ہے اور جانتے ہو کہ خدا تمہیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو مدد نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تمہارے نفسوں میں خرابی نہیں۔ تمہارا ایمان مضبوط ہے۔ تم تقویٰ کی راہ پر قدم مار رہے ہو۔ وساوس پر تمہیں قابو حاصل ہے تو ابتلاء تمہارے لئے خوف و خطرہ کا باعث نہیں ہو سکتے۔ مومن کو کبھی ڈر نہیں ہوتا۔ اس پر جب ابتلا آتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اس ابتلاء کے ساتھ ہی خدا کی مدد بھی آرہی ہے۔ مثنوی رومی والے نے اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا ہے۔

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است
زیر آں گنج کرم بنہادہ است

پس ہر ابتلا جو آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ خزانہ انعامات کا مخفی ہوتا ہے۔ اس لئے اصل خطرہ کی بات ابتلا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ابتلا کے تو یہ معنی ہوتے ہیں کہ اور ترقی خدا دے گا۔ ڈر اور خوف کی بات اپنے نفس کی حالت ہوتی ہے۔ اس کو ٹٹولنا اور دیکھنا چاہیئے کہ آیا اس میں تو کوئی ایسی بات پیدا نہیں ہوگئی جو تباہی کا باعث بن جائے اگر اس میں وساوس نہیں پیدا ہوئے۔ اگر ایمان مضبوط ہے اور دل شکر اور امتنان کے جذبات سے پر ہے تو خوش ہونا چاہیئے کیونکہ ایسی حالت میں ابتلا ڈر کا باعث نہیں بلکہ خوش خبری ہے۔ لیکن اگر ابتلا آنے پر وساوس پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایمان میں کمزوری معلوم ہوتی ہے۔ تو سمجھ لو کہ یہ ابتلاء تمہاری ترقی کا باعث نہیں بلکہ ہلاکت کا باعث ہوگا۔

پس ابتلاء کے وقت ابتلاء کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ اپنے نفس کو دیکھنا چاہیئے اگر تمہارا نفس مطمئن ہے۔ اگر اس میں کوئی نقص اور کمزوری نہیں پیدا ہوئی تو خوش ہو کہ تمہاری ترقی کا وقت آگیا۔ اور تمہارا قدم آگے بڑھنے لگا ہے۔ لیکن اگر نفس میں خرابی ہے۔ ایمان میں کمزوری ہے۔ اور دل میں وساوس ہیں تو سمجھ لو کہ تباہی آگئی ہے۔

ہماری جماعت کے لئے ابتلاء آنے ضروری ہیں اور آئے ہیں۔ لیکن پہلی جماعتوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ صحابہ کرام کو ایک دم کسی قدر ابتلاء آئے۔ ان کا تو عشر عشیر بھی نہیں۔ صحابہ پر یک دم سب ابتلاء آئے۔ مگر ہمارے لئے ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ سہار سہار کر ہم پر آرہے ہیں۔ ایک ابتلاء کے برداشت کرنے کی جب طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ تب دوسرا آتا ہے ہمارے ابتلاؤں کی

مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے نماز اور روزہ کے ابتلاء ہیں۔ کہ اگر سردی ہو۔ تو گرم پانی کر لیا جائے اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں تکلیف ہے تو بیٹھ کر پڑھ لی جائے۔ اور اگر روزہ نہیں رکھا جاتا تو دوسرے وقت میں رکھ لیا جائے۔ مگر صحابہ کے ابتلاء کی مثال یہ نہ تھی۔ بلکہ یہ تھی کہ جیسے یک دم مکان اوپر آگرے یا جیسے سارا سال محنت کرنے کے بعد جب کھیتی تیار ہو تو آگ لگ جائے۔

ہماری جماعت پر جو ابتلا آرہے ہیں۔ اگر پہلوں کے ابتلاؤں کو دیکھا جائے۔ تو اول تو میں اپنے لئے انہیں ابتلا کہنا ہی جائز نہیں سمجھتا۔ کیونکہ پہلوں کے مقابلہ میں انہیں ابتلا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر پھر بھی یہ ترقی کا زینہ ہیں۔ اگر ہماری جماعت کے لوگ ان کو برداشت کرلیں گے تو ترقی کے اعلیٰ زینہ اور ایمان کے اعلیٰ درجہ تک پہنچ جائیں گے۔ اور اصل اور حقیقی ایمان وہی ہوتا ہے جو ابتلاؤں میں سے گذرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ پس تم اپنے ایمانوں پر غور کرو۔ جس قسم کے تمہارے ایمان ہیں کیا ان کے بدلے میں تم پچاس سال کی زندگی پانے کے بھی مستحق ہو۔ اگر نہیں تو پھر ابدی زندگی کس طرح پا سکو گے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم پر ابتلاء آئیں۔ اور تمہارا ایمان پختہ ہو۔ کیونکہ اسی کے بعد ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے۔

خدا تعالیٰ ہم پر اپنا فضل کرے۔ اور محض اپنے کرم سے اپنا قرب عطا کرے۔ اور ہمیں ایسا ایمان نصیب کرے۔ جس کے بعد ابدی زندگی حاصل ہو۔

(الفضل ۶ر اپریل ۱۹۲۲ء)

۱؎ بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان